جائے۔ تاجروں اور معمولی زمینداروں یا رئیسوں سے معاملہ کرنے میں وہ بے رعایت صفائی کا برتاؤ کیا کرتے تھے۔ اور تعلیمیافتہ معزز آدمیوں سے اخلاق اور شرافت کا۔ ان موقعوں پر انہیں کسی مزید احتیاط کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس وقت انہیں وہ پریشانی ہو رہی تھی۔ جو لنکا کے کسی باشندے کو تبت میں ہو۔ جہاں کے رسم و رواج رفتار و گفتار کا اسے علم نہ ہو۔

دفعتہً ان کی نگاہ گھڑی پر پڑی۔ سہ پہر کے چار بج چکے تھے۔ پر گھڑی ابھی قیلولہ کر رہی تھی۔ تاریخ کی سوئی نے تیز روی میں وقت کو مات کر دیا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھے کہ گھڑی کو ٹھیک کر دیں۔ کہ اتنے میں رانی صاحبہ نے کمرے میں قدم رکھا۔ سائیں داس نے گھڑی کو چھوڑا۔ اور رانی صاحبہ کے قریب پہلو میں کھڑے ہو گئے۔ تصفیہ نہ کر سکے کہ ہاتھ ملاؤں۔ اس فروگزاشت کا اثر ایک اضطراب کی صورت میں ان کے چہرے پر نمودار ہو گیا۔ بارے رانی صاحبہ نے خود ہاتھ بڑھا کر انہیں اس الجھن سے نجات دی۔

رانی صاحبہ کا لباس بہت سادہ تھا۔ جُبّۂ نحیف، اس رعب اور تحکم کا شائبہ بھی نہ تھا۔ جو ثروت کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں سے ایک بے کسی کی سی جھلکتی تھی۔ چہرہ درد اور التجا کی تصویر تھا۔ اس پر حسرت کا وہ شوخ رنگ تھا جو دوسروں کو جبراً رعایت، احسان، اعانت پر مائل کرتا تھا۔ کوئی انسان جس کے پہلو میں دل ہو۔ اس کے جادو سے بے اثر نہ رہ سکتا تھا۔ ایک پیکر تالیف تھا۔ جس پر حسن و یاس کی تاثیر منقوش تھی۔ شامِ غم تھی۔ خاموش، زرد اور بے ہوا، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا زمانہ کے جور و ستم نے اس میں شکوۂ ستم کی آرزو بھی نہیں

باقی رکھی۔ جذبات دل فنا ہو گئے۔ اور تسلیم و توکل کے سوا اور کوئی سہارا باقی نہیں رہا۔

جب لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تو رانی کے پرائیویٹ سیکرٹری نے معاملہ کی بات چیت شروع کی۔ پہلے برہل کی پرانی عظمت کا قصہ کہنے کے بعد اس نے ان ترقیوں کا ذکر کیا۔ جو رانی صاحبہ کی ذات سے عمل میں آئیں۔ چنانچہ فی الحال نہروں کی ایک شاخ نکالنے کے لیے دس لاکھ روپیہ کی ضرورت درپیش تھی۔ اور باوجودیکہ رانی صاحبہ کسی انگریزی بینک سے معاملہ کر سکتی تھیں۔ مگر انہوں نے ایک ہندوستانی بینک کے حق کو مرجح سمجھا۔ اب یہ فیصلہ انڈسٹریل بینک کے اختیار میں تھا کہ وہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے یا نہیں۔

بنگالی بابو۔ ہم روپیہ دے سکتا ہے۔ مگر کاگذپتر دیکھے بنا کچھ نہیں کر سکتا۔

سیکرٹری۔ آپ کوئی ضمانت چاہتے ہیں۔؟

سائیں داس۔ (فیاضانہ انداز سے بولے) جناب ضمانت کے لیے آپ کی زبان کافی ہے۔

بنگالی بابو۔ آپ کے پاس ریاست کا کوئی حساب کتاب ہے؟

لالہ سائیں داس کو اپنے ہیڈ کلرک کی یہ دنیاداری سخت گیری ناگوار گزری۔ وہ اس وقت فیاضی کے نشہ میں مخمور تھے۔ رانی صاحبہ کی صورت التجا کافی ضمانت تھی۔ ان کے سامنے کاغذ اور حساب کا ذکر کرنا نابینا پن معلوم ہوتا تھا جس سے بے اعتباری کی بو آتی ہے۔ انہیں اس وقت حساب کتاب کا ذکر سلفہ پن معلوم ہو رہا تھا۔ صنفِ لطیف کے سامنے ہم فیاضی اور شرافت کے پتلے بن جاتے ہیں۔

بنگالی بابو کی طرف کڑی نگاہ سے دیکھ کر بولے "کاغذات کی جانچ کوئی لازمی امر نہیں ہے۔ شرط صرف ہمارا اطمینان ہے"۔

بنگالی بابو۔ ڈائریکٹر لوگ کبھی نہ مانے گا۔

سائیں داس۔ ہم کو اس کی پروا نہیں۔ ہم اپنی ذمہ داری پر روپے دے سکتے ہیں۔

رانی نے سائیں داس کی طرف نگاہِ تشکر سے دیکھا۔ ان کے ہونٹوں پر ایک خفیف سا تبسم نظر آیا۔ اس میں کچھ کامیابی کی مسرت تھی۔ کچھ صیاد کی سفاکی۔ اور کچھ سودائے خام کی حقارت۔

(۳)

مگر ڈائریکٹروں نے حساب کتاب، آمدنی اور خرچ دیکھنا ضروری سمجھا۔ اور یہ کام لالہ سائیں داس کے سپرد ہوا۔ کیونکہ کسی اور کو اپنے کاموں سے اتنی فرصت نہ تھی۔ کہ ایک پورے دفتر کا معائنہ کرتا۔ سائیں داس نے ضابطہ کی پابندی کی۔ تین چار دن تک کاغذات جانچتے رہے۔ اور اپنے اطمینان کی رپورٹ پیش کی۔ معاملہ طے ہوگیا۔ دستاویز مرتب ہوئی۔ روپیہ دیا گیا۔ شرح سود نو فیصدی قرار پایا۔

تین سال تک بینک کے کاروبار کو خوب فروغ ہوا۔ چھٹے مہینے بے طلب و تقاضا ۴۵ ہزار کی رقم یکمشت دفتر میں آجاتی تھی۔ معاملہ داروں کو پانچ فیصدی منافع دے دیا جاتا تھا۔ حصہ داروں کو ۷ فیصدی، اس طرح اس نفع کی کسر پوری ہو جاتی تھی۔ جو دوسرے وسائل سے حاصل ہوتا تھا۔ سائیں داس سے سب لوگ

خوش تھے۔ سب ان کی معاملہ فہمی کے مدّاح، یہاں تک کہ بنگالی بابو بھی رفتہ رفتہ ان کے قائل ہوتے جاتے تھے۔ سائیں داس ان سے کہا کرتے۔ "بابو جی! اعتبار دنیا سے کبھی عنقا ہوا ہے۔ اور نہ ہو گا۔ نیکی پر عقیدہ رکھنا ہر ایک انسان کا فرض ہے۔ جس شخص کے دل سے یہ عقیدہ اٹھ جاتا ہے۔ اسے زندہ درگور سمجھنا چاہیئے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ میں چاروں طرف سے دشمنوں سے گھرا ہوں۔ بڑے سے بڑا کامل فقیر اسے رنگا ہوا سیار معلوم ہوتا ہے۔ سچے سے سچا محب وطن اسے بندۂ شہرت نظر آتا ہے۔ اسے دنیا دغا اور فریب سے پر دکھائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے دل سے پرماتما کی عزت اور عظمت غائب ہو جاتی ہے۔ ایک مشہور فلاسفر کا قول ہے کہ ہر ایک انسان کو شریف سمجھو۔ تاوقتیکہ اس کے خلاف کوئی صریح ثبوت نہ ہو۔ موجودہ قوانین سیاست اسی معرکۃ الآرا اصول پر قائم ہیں۔ اور نفرت تو کسی سے کرنی ہی نہ چاہیئے۔ ہماری روحیں پاک ہیں۔ ان سے نفرت کرنا پرماتما سے نفرت کرنے کے برابر ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا میں دغا اور فریب نہیں ہے ہے اور بہت کثرت سے ہے۔ مگر اس کا علاج بدگمانی نہیں۔ قیافہ شناسی ہے۔ اور یہ خاص عطیہ ہے۔ جو ایشور کے دربار سے خاص خاص آدمیوں کو عطا ہوتا ہے۔ میں اس کا دعویٰ نہیں کرتا۔ پر مجھے یقین ہے کہ انسان کی صورت دیکھ کر میں اُس کے ضمیر کی تہ تک پہنچ جاتا ہوں۔ کوئی کتنا ہی بھیس بدلے۔ رنگ روپ بھرے۔ پر میری نگاہ باطن کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ یہ بھی خیال رکھیئے۔ کہ اعتبار سے اعتبار پیدا ہوتا ہے۔ اور بے اعتباری سے بے اعتباری۔ یہ فطرت کا قانون ہے۔ جس شخص کو ابتدا ہی سے شاطر، حریف، فتنہ باز سمجھ لیں گے۔ وہ کبھی آپ سے صفائی اور خوش

معاملگی نہ برتے گا۔ وہ ضدًا آپ کو زک دینے کی کوشش کرے گا۔ اس کے برعکس آپ ایک چور پر بھی اعتماد کریں۔ تو وہ آپ کا غلام ہو جائے گا۔ ساری دنیا کو لوٹے۔ پر آپ کو دغا نہ دے گا۔ وہ کتنا ہی بدکار سیاہ کار حرام کار کیوں نہ ہو۔ پر آپ اس کے گلے میں اعتبار کی زنجیر ڈال کر اسے جس طرف چاہیں لے جا سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ آپ کے ہاتھوں میں نیکی کا آلہ بن سکتا ہے"۔

بنگالی بابو کے پاس ان فلسفیانہ دلیلوں کا کوئی جواب نہ تھا۔

(۴)

چوتھے سال کی پہلی ششماہی کی آخری تاریخ تھی۔ لالہ سائیں داس بینک کے دفتر میں بیٹھے ہوئے ڈاکیئے کی راہ دیکھ رہے تھے۔ آج برہل سے پینتالیس ہزار روپیہ آئیں گے۔ اس لیے ششماہی منافع کا تخمینہ مرتب کر چکے تھے۔ اب کے ان کا ارادہ تھا کہ کچھ فرنیچر اور خریدیں۔ اب تک بینک میں ٹیلی فون نہیں تھا۔ اس کا تخمینہ بھی طلب کر لیا تھا۔ امید کی مسرت چہرہ پر جھلک رہی تھی۔ مذاقًا کبھی بنگالی بابو سے کہتے۔ اس تاریخ کو میرے ہاتھوں میں خواہ مخواہ کھجلی ہونے لگتی ہے۔ آج بھی ہتھیلی کھجلا رہی ہے"۔ کبھی دفتری سے کہتے "ارے میاں شفقت ذرا استخارہ تو کرو۔ محض سود ہی سود آ رہا ہے۔ یا دفتر والوں کے لیے کچھ نذرانہ شکرانہ بھی ہے"۔ امید کا اثر شاید در و دیوار پر بھی ہوتا ہے۔ بینک آج شگفتہ نظر آتا تھا۔

ڈاکیہ عین وقت پر آیا۔ سائیں داس نے ایک شان استغنا سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے تھیلے سے کئی رجسٹرڈ لفافے نکالے۔ سائیں داس نے ان لفافوں

کو اڑتی ہوئی نگاہ سے دیکھا۔ پر بل کا کوئی لفافہ نہ تھا، نہ بیمہ، نہ مہر نہ وہ تحریر، کچھ مایوسی سی ہوئی۔ جی میں آیا ڈاکیئے سے پوچھیں۔ کوئی اور رجسٹری رہ تو نہیں گئی۔ پر ضبط کیا، دفتر کے کلرکوں کے روبرو اتنی بے صبری شان کے خلاف تھی۔ مگر جب ڈاکیہ چلنے لگا۔ تو ان سے رہا نہ گیا۔ پوچھ ہی بیٹھے۔ "ارے بھئی کوئی بیمہ شدہ لفافہ رہ تو نہیں گیا؟ آج سے اُسے آنا چاہیے تھا۔" ڈاکیے نے کہا۔ "سرکار بھلا ایسی بات ہے اور کہیں بھول چوک ہو جائے۔ پر حضور کے کام میں ایسی بھول ہو سکتی ہے۔"

سائیں داس کا چہرہ اتر گیا۔ جیسے کچے ونگ پر پانی پڑ جائے، ڈاکیہ چلا گیا۔ تو بنگالی بابو کی طرف خطاوار نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ "یہ دیر کیوں ہوئی؟ پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوتا تھا۔"

بنگالی بابو نے نا ہمدردانہ انداز سے جواب دیا۔ کسی سبب دیری ہو گیا ہو گا۔ گھبرانے کا کوئی بات نہیں ہے۔

مایوسی محال کو ممکن بنا دیتی ہے۔ سائیں داس کو اس وقت یہ خیال ہوا کہ شاید پارسل سے روپے آتے ہوں۔ ہو سکتا ہے۔ تین اشرفیوں کو پارسل کر دیا ہو۔ اگرچہ وہ کسی سے اس خیال کو ظاہر کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ پر انہیں یہ امید اس وقت تک لگی رہی۔ جب پارسل والا پوسٹ مین واپس نہ گیا۔ آخر شام کو وہ ایک پریشانی کی حالت میں اُٹھ کر گھر چلے گئے۔ اب خط یا تار کا انتظار تھا۔ دو تین بار جھنجھلا کر اٹھے۔ کہ ڈانٹ کر ایک خط لکھوں۔ اور صاف صاف کہہ دوں۔ کہ ایسے معاملات میں وہ وعدہ خلافی سخت معاملگی کا ثبوت دیتا ہے۔ ایک دن کی تاخیر بھی بینک کے لیے مہلک ہو سکتی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ ایسی شکایت کا موقع نہ ملے گا۔

مگر پھر کچھ سوچ کر نہ لکھا۔

شام ہو گئی تھی۔ کئی احباب آ گئے۔ گپ شپ ہونے لگی۔ کہ پوسٹ مین نے آ کر شام کی ڈاک سامنے داس کو دی۔ یوں وہ پہلے اخبار کو کھولا کرتے تھے۔ پر آج چٹھیاں کھول لیں۔ مگر برہل کا کوئی خط نہ تھا۔ تب بے دلی کے ساتھ ایک انگریزی اخبار کھولا۔ اور پہلے ہی تار کا عنوان دیکھ کر ان کا خون سرد ہو گیا۔

"کل شام کو رانی صاحبہ برہل نے تین دن کی بیماری کے بعد وفات پائی"

اس کے آگے ایک مختصر نوٹ میں یہ مضمون درج تھا۔

"رانی صاحبہ برہل کی مرگ بے ہنگام صرف اس ریاست کے لیے نہیں بلکہ کل صوبے کے لیے ایک افسوس ناک سانحہ ہے۔ حکمار حاذق مرض کی تشخیص بھی نہ کر سکے تھے، کہ موت نے قصہ تمام کر دیا۔ رانی صاحبہ کو اپنی ریاست کی بہتری کا خیال ہمیشہ مدِّ نظر رہتا تھا۔ ان کے مختصر دوران حکومت میں ان کی ذات سے ریاست کو جو فیوض حاصل ہوئے ہیں۔ وہ عرصہ تک یادگار رہیں گے۔ اگرچہ یہ مسلّمہ امر تھا۔ کہ ریاست ان کے بعد دوسرے ہاتھوں میں جائے گی۔ مگر یہ خیال رانی صاحبہ کے ادائے فرض میں کبھی مخل نہ ہوا۔ قانوناً انہیں ریاست کی کفالت پر کسی قسم کے مالی معاملہ کرنے کا مجاز نہ تھا۔ مگر رعایا کے فلاح و اصلاح نے کئی موقعوں پر اس اس پابندی کو نظر انداز کرنے پر مجبور کیا۔ ہم کو یقین ہے کہ اگر ان کی زندگی نے چند سال اور وفا کی ہوتی۔ تو ریاست ان کفولیتوں سے سبکدوش ہو جاتی۔ انہیں شب و روز اس کی فکر تھی۔ قانونی پیچیدگیوں سے مغالطہ دینے کا گمان انہیں کبھی نہیں ہوا۔ مگر بے وقت موت نے اب یہ فیصلہ دوسرے ہاتھوں میں دے دیا ہے۔ دیکھنا چاہیے۔ ان کفولیتوں کا کیا

حشر ہوتا ہے۔ ہمیں معتبر وسائل معلوم ہوا ہے۔ کہ نئے راجہ صاحب نے جو آج کل لکھنؤ میں رونق افروز ہیں۔ اپنے وکلاء کے مشورے کے مطابق مرحومہ کی مالی موخذات سے انکار کر دیا ہے۔ ہمیں خوف ہے کہ عنقریب لکھنؤ کے مالی حلقے میں ایک زبردست ہل چل پیدا ہوگی۔ اور کتنے ہی اصحاب زر کو سبق مل جائے گا۔ کہ سود کی ہوس خرم واحتیاط کی قیدیوں سے آزاد ہو کر کتنی مضرت کا باعث ہوتی ہے۔

لالہ سائیں داس نے اخبار میز پر رکھ دیا۔ اور آسمان کی طرف تاکا۔ جو مایوسی کا آخری سہارا ہے۔ دوسرے احباب نے یہ خبر پڑھی۔ باہم اس مسئلہ کے قانونی پہلو پر گفتگو ہونے لگی۔ نوبت تکرار وحجت تک پہنچی۔ سائیں داس پر چاروں طرف سے بوچھاڑ پڑنے لگی۔ سارا الزام ان کے سر منڈھا گیا۔ اور ان کی ایک مدت کی کاردانی، معاملہ فہمی اور مال اندیشی تک خاک میں مل گئی۔ بینک کے لیے اتنا زبردست نقصان برداشت کرنا غیر ممکن تھا اور اب یہ مسئلہ درپیش تھا۔ کہ اس کا وجود کیونکہ قائم رہے۔

(۵)

اس کے بعد ہفتوں تک متواتر صبح سے شام تک بینک میں بازکش معاملہ داروں کا تانتا لگا رہتا۔ جن لوگوں کی رقمیں بغیر مدت کی قید کے جمع تھیں۔ وہ اف کی واپسی پر بہ ضد تھے۔ اور کوئی عذر نہ سنتے تھے۔ معلوم نہیں یہ اسی اخبار کے نوٹ کا اثر تھا یا رقیبوں کی خفیہ زلیۃ دوانیوں، کہ انڈسٹریل بینک کے خلاف سارے شہر میں بدگمانی پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں۔ کہ اگر لوگ صبر سے کام لیتے، تو ایسی صورتیں پیدا ہو جاتیں۔ کہ بینک اس صدمہ سے جانبر ہو جاتا۔ مگر شورش اور

طوفان میں کون سی کشتی ساکت رہ سکتی ہے؟ آخر خزانچی نے انکاری جواب دینے شروع کیے بینک کی رگوں سے خون کی اتنی دھاریں نکلیں کہ وہ بے جان ہو گیا۔

دو ماہ گزر گئے تھے۔ احاطہ میں ہزاروں سوداگران بینک جمع تھے۔ مگر مرنے والے کی آنکھیں بند تھیں۔ نبض ساکت، زبان خاموش، آہ و بکا کی دلدوز صدائیں اٹھ رہی تھیں۔ پر یہ صدائے ماتم اس کے کانوں تک نہ پہنچتی تھی۔ بینک کے دروازے پر مسلح سپاہیوں کا پہرہ تھا۔ دم دم پر طرح طرح کی افواہیں اڑتی تھیں۔ اور ہر ایک افواہ میں اس مجمع کثیر کو ہمہ تن گوش و ہمہ تن چشم بنا دیتی تھی۔ کبھی خبر اڑتی تھی، کرلالہ سائیں داس نے زہر کھا لیا، کوئی ان کی گرفتاری کی جز لاتا تھا۔ کوئی کہتا تھا۔ ڈائریکٹر صاحبان زیرِ حراست ہو گئے۔

اور یہ کیفیت احاطہ ہی تک محدود نہ تھی۔ شہر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ رونے والوں سے زیادہ دردناک حالت ان کی تھی جن کی آنکھیں شرمندۂ نم نہ ہو سکتی تھی جنہیں خاندانی وقار خودداری پر مجبور کیے ہوئے تھا۔

آفتاب غروب ہو گیا۔ صبر میں انتظار کی طاقت نہ رہی۔ ڈوبنے والے آفتاب کی طرح وہ بھی مایوسی کی تاریکی میں ڈوب گیا۔ مجمع رفتہ رفتہ کم ہونے لگا۔ دفعتہً سڑک پر سے ایک موٹر نکلا۔ اور بینک کے سامنے آکر رک گیا۔ کسی نے کہا، برہل کے راجہ صاحب کا موٹر ہے۔ اتنا سنتے ہی سینکڑوں آدمی وحشت کے عالم میں موٹر کی طرف دوڑے۔ مگر شکوۂ بے داد کے لیے نہیں۔ صرف اس شخص کی صورت دیکھنے کے لیے جو ان کی کشتِ اُمید کا شرر تھا۔ جس کے ہاتھوں ان کی قسمتیں پامال ہو رہی تھیں۔

نوجوان کنور جگدیش سنگھ رانی صاحبہ کی وفات کے بعد وکیلوں سے قانونی مشورہ

لینے کے لیے لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ رئیسانہ لوازمات کی خرید بھی ضروری تھی وہ آرزوئیں جو ایک مدت سے اسی موقع کی منتظر تھیں۔ اب بندھے ہوئے پانی کی طرح راہ پاکر اُبلی پڑتی تھیں۔ یہ موٹر آج ہی لیا تھا۔ شہر میں ایک بنگلہ کے متعلق بات چیت ہو رہی تھی۔ بیش قیمت فرنیچر اور شیشہ آلات کی ایک گاڑی بریلی روانہ ہو چکی تھی۔ انگریزی جوہری بھی ان کی قدر دانیوں سے محروم نہ تھے۔ ارباب نشاط کی مجلسیں روزانہ آراستہ ہوتیں۔ یہاں سے فرصت ملتی تو تھیٹر کی باری آتی۔ چڑیا قفس سے آزاد ہو کر ہر ایک ڈالی پر چہکتی پھرتی تھی۔ یہ مجمع دیکھا۔ تو خیال کیا کہ کوئی نیا تماشا ہونے والا ہے۔ موٹر روک دیا۔ کہ اتنے میں صدہا آدمیوں نے آکر موٹر کو گھیر لیا۔

کنور صاحب نے پوچھا "یہاں آپ لوگ کیسے جمع ہیں۔ کوئی تماشا ہونے والا ہے کیا؟"

ایک صاحب جو وضع سے کوئی بگڑے رئیس معلوم ہوتے تھے، بولے "جی ہاں بڑا دلچسپ تماشا ہے"۔

کنور۔ کس کا تماشا ہے"۔

"قسمت کا"

کنور صاحب کو اس جواب پر حیرت تو ہوئی، مگر سُنتے آئے تھے۔ کہ لکھنؤ والے بات بات پر شاعری کیا کرتے ہیں۔ اس لیے اسی انداز سے جواب دینا بھی ضروری معلوم ہوا، بولے "قسمت کا تماشا دیکھنے کے لیے یہاں آنا تو ضروری نہیں"۔

لکھنوی حضرت نے فرمایا۔ جناب کا فرمانا بجا ہے۔ مگر دوسری جگہ یہ لُطف

کہاں۔ یہاں آج صبح سے شام تک قسمت نے کتنوں ہی کو امیر سے غریب، اور کتنوں ہی کو غریب سے فقیر بنا دیا۔ جو لوگ محلوں میں بیٹھتے تھے، اس وقت انہیں درخت کی چھاؤں بھی میسر نہیں۔ جن کے دروازے پر زکوٰۃ بٹتی تھی۔ اس وقت روٹیوں کو محتاج ہیں۔ ابھی تک ایک ہفتہ قبل جو لوگ شکوۂ روزگار اور نیرنگی تقدیر اور جور فلک کو شاعرانہ استعارات سمجھا کرتے تھے۔ اس وقت ان کی آہ وزاری نالۂ عشق کو بھی شرمندہ کر رہی ہے۔ ایسے عبرت خیز تماشے اور کہاں دیکھنے میں آئیں گے۔

کنور صاحب اب اپنی حیرت کو نہ چھپا سکے۔ پوچھا، جناب آپ نے تو معمے کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا۔ میں دہقانی آدمی ہوں۔ مجھ سے نثر میں بات کیجیے۔

اس پر ایک جنٹلمین نے فرمایا۔ "حضرت یہ انڈسٹریل بینک ہے۔ اس کا دیوالہ ہو گیا ہے۔ آداب عرض ہے، بندہ کو پہچانا؟"

کنور صاحب نے ان کی طرف دیکھا تو موٹر سے اچھل پڑے۔ اور نیچے آ کر ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولے۔ "ارے مسٹر نسیم؟ تم یہاں کہاں؟ یار تم سے مل کر روح تازہ ہو گئی۔"

مسٹر نسیم کنور صاحب کے ساتھ ڈیرہ دون کالج میں پڑھتے تھے۔ دونوں ساتھ ساتھ ڈیرہ دون کی پہاڑیوں کی سیر کرنے جایا کرتے تھے۔ مگر جب سے کنور صاحب نے خاندانی حالات سے مجبور ہو کر کالج چھوڑا۔ دونوں دوستوں میں ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ نسیم بھی ان کے آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد اپنے وطن لکھنؤ چلے آئے تھے۔

نسیم نے جواب دیا۔ "شکر ہے، آپ نے پہچانا تو کہئے اب تو پو بارہ ہیں۔ کچھ

دوستوں کی بھی خبر ہے؟"

کنور۔ یار مبالغہ نہیں، تمہاری یاد ہمیشہ آیا کرتی تھی۔ کہو آرام سے تو ہو؟ میں رائل ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ آج آؤ، تو اطمینان سے باتیں ہوں۔

نسیم۔ جناب اطمینان تو انڈسٹریل بینک کے ساتھ رخصت ہو گیا ہے۔ اب تو فکر معاش سر پہ سوار ہے۔ جو کچھ جمع تھی، آپ کے نذر ہوئی۔ اس دیوالہ نے فقیر بنا دیا۔ اب آپ کے آستانوں پر دھرنا دوں گا۔

کنور۔ یار تمہارا گھر ہے، بے تکلف آؤ، میرے ساتھ ہی کیوں نہ چلو؟ کیا بتاؤں، مجھے مطلق معلوم نہ تھا۔ کہ میری دست کشی کا یہ اثر ہو گا۔ معلوم ہوتا ہے بینک نے بہتیروں کو تباہ کر دیا۔

نسیم۔ گھر گھر کہرام مچا ہوا ہے۔ میرے پاس اس جسم پر کے کپڑوں کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔

اتنے میں ایک تلک دھاری پنڈت جی آ گئے۔ اور بولے "مہاراج! آپ کے جسم پر کپڑے تو ہیں۔ یہاں تو دھرتی اکاش کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔ میں راگھو جی پاٹ سالا کا ادھیاپک ہوں۔ پاٹ سالا کا سب روپیہ اسی بینک میں جمع تھا۔ پچاس ودیارتھی۔ اس کی بدولت سنسکرت پڑھتے تھے۔ اور بھوجن پاتے تھے۔ کل سے پاٹ سالہ بند ہو جائے گا۔ دور دور کے ودیارتھی ہیں۔ وہ اپنے گھر کیسے پہنچیں گے۔ یہ ایشور ہی جانے"۔

ایک صاحب جن کے سر پہ پنجابی وضع کی پگڑی تھی۔ گاڑھے کا کوٹ اور چمرودہا جوتا پہنے ہوئے تھے، آگے بڑھ آئے۔ اور ایک شان نیابت سے بولے

جناب اس بینک کے فیلیور نے کتنے ہی انسٹی ٹیوشنوں کا خاتمہ کر دیا۔ لالہ دینا ناتھ کا یتیم خانہ ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔ اس کا ایک لاکھ روپیہ ڈوب گیا۔ ابھی پندرہ دن ہوئے ہیں۔ ڈیپوٹیشن سے لوٹا۔ تو پندرہ ہزار روپے یتیم خانہ کے فنڈ میں جمع کیے تھے۔ مگر اب کہیں کوڑی کا بھی ٹھکانا نہیں۔"

ایک کہن سال بوڑھے نے کہا۔ "صاحب میری تو عمر بھر کی کمائی مٹی میں مل گئی۔ اب کفن کا بھی بھروسہ نہیں۔"

رفتہ رفتہ اور لوگ جمع ہو گئے۔ اور عام گفتگو ہونے لگی۔ ہر شخص اپنے قریب کے آدمی کو اپنی مصیبت کی داستان سنانے لگا۔ کنور صاحب آدھ گھنٹہ تک نیم کے ساتھ کھڑے یہ فسانۂ غم سنتے رہے۔ جوں ہی موٹر پر بیٹھے اور ہوٹل کی طرف چلنے کا حکم دیا۔ ان کی نگاہ ایک خستہ حال آدمی کی طرف گئی۔ جو زمین پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ یہ ایک اہیر تھا۔ کنور صاحب کے ساتھ بچپن میں کھیلا تھا۔ اس وقت ان میں رتبہ کی یہ تمیز نہ تھی۔ کنور صاحب نے بار بار اس کی دھولیں کھائی تھیں۔ اس کی گالیاں سنی تھیں۔ دونوں ساتھ کبڈی کھیلتے تھے۔ ساتھ پیڑوں پر چڑھ کر چڑیوں کے بچے چراتے تھے۔ جب کنور صاحب ڈیڑھ دو دن پڑھنے گئے۔ تو یہ اہیر کا لڑکا شیو داس اپنے باپ کے ساتھ لکھنؤ چلا آیا جس نے یہاں ایک دودھ کی دکان کھول لی تھی۔ کنور صاحب نے اسے پہچانا۔ اور زور سے پکارا۔ "ارے شیو داس؟ ادھر دیکھو شیو داس ادھر دیکھو۔" شیو داس نے آواز سنی۔ مگر سر اوپر نہ اٹھایا۔ وہ اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا کنور صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ بچپنے کے وہ دن یاد آ رہے تھے۔ جب وہ جگدیش کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتا تھا۔ جب دونوں بڈھے غفور میاں کا منہ چڑا

کر گھر میں چھپ جاتے تھے۔ جب وہ اشارے سے جگدیش کو ماسٹر کے پاس سے بُلا لیا کرتا۔ اور دونوں رام لیلا دیکھنے چلے جاتے۔ اسے یقین تھا کہ کنور صاحب مجھے بھول گئے ہوں گے۔ وہ بچپن کی باتیں اب کہاں۔ کہاں میں اور کہاں وہ! لیکن جب کنور صاحب نے اس کا نام لے کر پکارا، تو بجائے اس کے کہ وہ خوش ہو کر ان سے ملے۔ اس نے اور بھی سر جھکا لیا۔ اور وہاں سے سرک جانا چاہا۔ کنور صاحب کا اخلاق اب اس خلیج پر حاوی نہیں ہو سکتا تھا۔ جو ان کے اور اس کے درمیان حائل تھی۔ مگر کنور صاحب اسے کھسکتے دیکھ کر موٹر سے اتر کر اس کے پاس آئے، اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ "ارے شیو داس کیا مجھے بھول گئے"!

شیو داس کو اس آواز میں پرانی بے تکلفی کا احساس ہوا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ کنور صاحب کے گلے سے لپٹ گیا۔ اور بولا "بھولا تو نہیں۔ پر آپ کے سامنے آتے ہوئے شرم آتی ہے"!

کنور۔ یہاں دودھ کی دکان کرتے ہو کیا؟ مجھے معلوم ہی نہ تھا۔ نہیں تو ایک ہفتے سے پانی پیتے پیتے زکام کیوں ہوتا؟ آؤ اس موٹر پر بیٹھ جاؤ۔ میرے ساتھ ہوٹل تک چلو، تم سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ تمہیں [illegible] لے چلوں گا۔ اور ایک بار پھر گلی ڈنڈا کھیلیں گے۔

شیو داس۔ ایسا نہ کیجیے، نہیں تو دیکھنے والے ہنسیں [illegible] ہوٹل میں آجاؤں گا۔ وہی حضرت گنج والے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں نہ۔

کنور۔ ضرور آؤ گے نہ؟

شیو داس۔ آپ آئیں گے۔ اور میں نہ آؤں گا!؟

کنور۔ یہاں کیسے بیٹھے ہو۔ دکان تو چل رہی ہے نا؟

شیو داس۔ آج صبح تک تو چلتی تھی۔ پر آگے کا حال نہیں معلوم؟

کنور۔ تمہارے روپے بھی بینک میں جمع تھے کیا؟

شیو داس۔ اب آؤں گا تو بتاؤں گا۔

کنور صاحب موٹر پر آ بیٹھے۔ اور شوفر سے کہا۔ ہوٹل کی طرف چلو۔

شوفر۔ حضور نے ہائٹ وے کمپنی کی دکان پر چلنے کا حکم دیا تھا۔

کنور۔ اب ادھر نہ جاؤں گا۔

شوفر۔ جیکب صاحب بالنٹر کے یہاں بھی نہ چلوں؟

کنور۔ (جھنجھلا کر) نہیں کہیں مت چلو۔ مجھے سیدھے ہوٹل پہنچا دو۔

یاس و درد کے ان نظاروں نے جگدیش سنگھ کے دل میں سوال پیدا کر دیا تھا۔ اب میرا کیا فرض ہے"؟

(۶)

آج سے سات برس پہلے جب برہل کے راجہ صاحب نے عین عالم شباب میں گھوڑے سے گر کر وفات پائی، اور وراثت مسئلہ پیش ہوا۔ تو راجہ صاحب کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ خاندانی سلسلہ میں ان کے حقیقی چچا زاد بھائی ٹھاکر رام سنگھ کو وراثت کا حق پہنچتا تھا۔ انہوں نے دعویٰ کیا۔ مگر عدالتوں نے راجہ صاحب کی بیوی کے حق میں فیصلہ کیا۔ ٹھاکر صاحب نے اپیلیں کیں۔ پریوی کونسل تک گئے۔ مگر کامیاب نہ ہوئے۔ مقدمہ بازی میں لاکھوں روپے صرف ہو گئے۔ اپنے حصّہ کی جائداد بھی ہاتھ سے نکل گئی۔ مگر مقدمہ ہارنے پر بھی وہ اطمینان سے نہیں بیٹھے۔ ہمیشہ

بیوہ رانی صاحبہ کو چھیڑتے رہتے۔ کبھی آسامیوں کو بھڑکاتے کبھی عوام کو رانی صاحبہ سے بدظن کرتے، کبھی فرضی مقدمات میں پھنسانے کی کوشش کرتے۔ مگر رانی صاحبہ بھی بڑے جیوٹ کی عورت تھیں۔ وہ ٹھاکر صاحب کے ہر ایک وار کا دندان شکن جواب دیتیں۔ ہاں اس کش مکش میں انہیں کثیر رقمیں خرچ کرنا پڑتیں۔ آسامیوں سے روپے وصول نہ ہوتے۔ اس لیے بار بار قرض لینے پڑتے تھے۔ مگر چونکہ قانوناً وہ ریاست کفولیت پر قرض لینے کی مجاز نہ تھیں۔ اس لیے انہیں یا تو اس قانونی پیچیدگی کو چھپانا پڑتا تھا۔ یا سود کی بہت اونچی شرح قبول کرنا پڑتی تھی۔

کنور جگدیش سنگھ کا زمانہ طفولیت تو ناز و نعمت میں کٹا تھا مگر جب ٹھاکر رام سنگھ ان مقدمہ بازیوں سے بہت زیر بار ہو گئے۔ اور یہ اندیشہ بھی ہوا، کہ کہیں رانی صاحبہ کی سازشوں سے کنور صاحب کی جان خطرہ نہ پڑ جائے۔ تو انہوں نے مجبور ہو کر کنور صاحب کو ڈیرہ دون بھیج دیا۔ کنور صاحب وہاں دو سال تک آرام سے رہے۔ لیکن جونہی وہ کالج کی پہلی جماعت میں داخل ہوئے ٹھاکر صاحب راہیٔ ملکِ عدم ہو گئے۔ کنور صاحب کو سلسلۂ تعلیم قطع کرنا پڑا۔ برہل چلے آئے۔ سر پر خاندان کی پرورش اور رانی صاحبہ سے پرانی عداوت نبھانے کا بار آپڑا اس وقت سے رانی صاحبہ کی وفات تک ان کی حالت بہت ابتر رہی۔ آمدنی کا ذریعہ یا تو قرض تھا یا مستورات کے زیور۔ اس پر خاندانی وقار کے قائم رکھنے کی فکر، یہ تین سال ان کے لیے سخت آزمائش کے دن تھے۔ ساہوکاروں سے آئے دن سابقہ رہتا تھا۔ ان کے تیرِ ستم سے جگر میں ناسور پڑ گیا تھا۔ حکام کی سخت گیریاں اور بدعتیں بھی برداشت کرنا پڑتیں۔ مگر سب سے دلخراش اپنے

عزیزوں اور یگانوں کا برتاؤ تھا جو سامنے دار تہ کر کے بغلی چوٹیں کرتے تھے۔ دوستی اور یگانگت کے پردے میں دغا کے ہاتھ چلاتے تھے۔ ان تجربات تلخ نے کنور صاحب کو اختیار اور ثروت اور دولت کا جانی دشمن بنا دیا تھا۔ وہ نہایت ذکی الحس آدمی تھے۔ اور یگانوں کی بے مہریاں اور ابنائے وطن کی بے وفائیاں ان کے دل پر داغِ سیاہ بنتی جاتی تھیں۔ ادبیات کے ذوق نے انہیں انسانی فطرت کے مطالعہ کا خوگر بنا دیا تھا۔ اور یہ مطالعہ ہی انہیں روز بروز مہذب طبقہ سے دور لیے جاتا تھا۔ وہاں ان کے دل میں جمہوریت اور غریب دوستی کے خیالات راسخ گرتا جاتا تھا۔ ان پر روشن ہو گیا تھا۔ کہ سچی انسانیت اگر زندہ ہے تو جھونپڑوں میں اور افلاس میں۔ یہیں اس مصیبت کے زمانے میں جب چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ انہیں کبھی کبھی سچی ہمدردی اور خلوص کی روشنی نظر آجاتی تھی۔ اسی طبقہ میں وفادار اور غمگسار دوست ملتے تھے۔ دولت اور ثروت ان کی نگاہ میں ظاہر داری اور تکلف کا مترادف تھی۔ وہ اسے نعمتِ عظمیٰ کی بجائے قہرِ الٰہی سمجھتے تھے۔ جو انسان کے دل سے انسانیت اور محبت کے جذبات کو مٹا دیتی ہے۔ وہ ابرِ سیاہ ہے۔ جو دل کے روشن تاروں پر چھا جاتی ہے۔

مگر رانی صاحبہ کی وفات کے بعد جونہی دولت اور ثروت نے ان پر وار کیا۔ فلسفیانہ خیالات کی یہ سپر پاش پاش ہو گئی۔ دل پر ایک خود فراموشی کا نشہ چھا گیا۔ تحقیق باطن کی قوت زائل ہو گئی۔ وہ لوگ دوست ہو گئے جنہیں وہ دشمن سمجھتے تھے۔ وہ تغافل اور سرد مہری کی زد میں آگئے۔ جمہوریت کے دلائل میں حیرت انگیز ترمیم شروع ہوئی۔ ایک متملانہ رواداری کا احساس

رونما ہوا ہوا۔ فلسفۂ یاس نے فلسفۂ امید کو جگہ دی۔ حفظ وقار اور مناسبت حال کی زنجیر گلے میں پڑی۔ شعلہ درد انگیز نفسِ بلّوریں میں روپوش ہوا، دولت اور ثروت کے مینارِ بلند نے افلاس کے جھونپڑوں کو نظر سے پوشیدہ کر دیا۔ آئین مراسم نے زبان پر مُہر احتیاط لگا دی۔ وہ اربابِ اختیار جنہیں دیکھ کر ان کے تیور بدل جاتے تھے۔ اب ان کے مشیر ہو گئے۔ بے نوائی اور برہنگی اور قناعت جو ان کی دل سوزیوں کی منظورِ نظر تھی۔ اب اسے دیکھ کر ان کی آنکھیں جُھک جاتی تھیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کنور صاحب اب بھی جمہوریت کے قائل تھے۔ مگر ان کے اظہار میں وہ پہلے کی سی آزادی نہ تھی۔ قول اب فعل سے قریب تر ہونے کے باعث باہر نکلتے ہوئے ڈرتا تھا۔ وہ پہلے کی سی طرار و تیز شمشیر برہنہ نہ تھی۔ اس میں اب زنگ لگ گیا تھا۔ قول کے عملی کو اب وہ نظر انداز نہ کر سکتے تھے۔ اور میدانِ عمل انہیں دشواریوں سے پر نظر آتا تھا۔ بیگار کے وہ جانی دشمن تھے۔ مگر بیگار کو بند کرنا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ صحت و صفائی کے زبردست مؤید تھے۔ مگر اب خرچ سے قطع نظر باشندوں ہی کی طرف سے انحراف کا گمان ہوتا تھا۔ آسامیوں کے ساتھ لگان کے لیے سختی و جبر کو وہ شرک سمجھتے تھے۔ مگر اب وہ ضروری نظر آتی تھی۔ غرض کتنے ہی اصول جو پہلے جزو ایمان بن چکے تھے اب دائرہ عمل سے خارج ہوتے جاتے تھے۔

مگر آج بینک کے احاطہ میں جو دردناک نظارے ان کی نگاہ سے گزرے ان کے خفیہ جذبات درد کے لیے بانگِ سحر کا کام کر گئے۔ بے کسی اور مجبوری کے

وہ دلفگار نالے گوشۂ جگر میں چبھ گئے۔ اس شخص کی سی حالت ہوگئی۔ جو کشتی پر بیٹھا دریا کے پر فضا ساحل کی سیر کرتا ہوا یکایک مرگھٹ کے سامنے آجائے۔ چتا پر لاشیں جلتے ہوئے دیکھے۔ سوگواروں کی آہ وزاریاں سنے۔ اور کشتی سے اتر کر سوگواروں کے ماتم میں شریک ہوجائے۔

رات کے دس بج گئے تھے۔ کنور صاحب پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے احاطۂ بینک کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ وہی صدائیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ دل میں سوار ہو رہا تھا۔ کیا اس تباہی و بربادی کا باعث میں ہوں۔ میں نے وہی کیا جس کا مجھے قانوناً اور اخلاقاً پورا مجاز تھا۔ یہ بینک کے کارکن لوگوں کی غلطی ہے کہ انہوں نے بغیر کافی ضمانت کے اتنی بڑی رقم قرض دے دی۔ معاملہ داروں کو انہیں کی گردن پکڑنی چاہیے۔ میں کوئی خدائی فوجدار نہیں ہوں۔ کہ دوسروں کی حماقتوں کا خمیازہ اٹھاؤں۔ ناحق اس ہوٹل میں ٹھہرا۔ چالیس روپے روز دینے پڑیں گے۔ کوئی چار سو روپے کے متھے جائے گی۔ اتنا سامان بھی بیکار لیا۔ کیا ضرورت تھی مخملی گدے کی کرسیوں سے یا شیشۂ آلات کی سجاوٹ سے میری حقیقی شان نہیں بڑھ سکتی۔ کوئی معمولی مکان پانچ روپے روزانہ پر لے لیتا تو کیا کام نہ چلتا۔ میں اور ساتھ کے سب آدمی آسائش سے رہتے۔ یہی ہوتا نا؟ کہ لوگ بدنام کرتے۔ اس کی کیا پروا۔ جن لوگوں کے ماتھے پر ٹھاٹ کر رہا ہوں۔ وہ غریب تو روٹیوں کو بھی محتاج ہیں۔ یہ دس بارہ ہزار روپے لگا کر اگر کنویں بنوا دیتا، تو ہزاروں غریبوں کا بھلا ہو جاتا۔ اب آئندہ سے لوگوں کے چکمے میں نہ آؤں گا۔ یہ موٹر کار بالکل فضول ہے۔ میرا وقت اتنا قیمتی نہیں ہے کہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی کفایت کی

خاطر دو سو روپیہ مہینہ کا خرچ بڑھا لوں۔ فاقہ کش اسامیوں کے سامنے موٹر دوڑانا ان کی چھاتیوں پر مونگ دلنا ہے۔ مانا کہ وہ رعب میں آجائیں گے۔ جدھر سے نکل جاؤں گا۔ سینکڑوں بچے اور عورتیں تماشا دیکھنے کے لیے گھروں سے نکل آئیں گے۔ پر محض اتنی سی تسکینِ نخوت کے لیے اتنا خرچ بڑھانا حماقت ہے۔ اگر دوسرے رؤسا ایسا کرتے ہیں تو کریں۔ میں ان کی ریس کیوں کروں۔ اب تک دو ہزار روپیہ میں میرا سالانہ گزر ہو جاتا تھا۔ اب دو کے بدلے چار ہزار بہت ہیں۔ اور پھر مجھے دوسروں کی کمائی کو یوں اڑانے کا مجاز ہی کیا ہے؟ میں کوئی محنت نہیں کرتا۔ کوئی تجارت کوئی کاروبار نہیں کرتا جس کا یہ نفع ہو۔ اگر میرے بزرگوں نے اپنی ہٹ دھرمی اور زبردستی سے کچھ علاقہ اپنے قبضہ میں کر لیا۔ تو مجھے ان کے مالِ غنیمت میں شریک ہونے کا کیا حق ہے؟ جو لوگ محنت کرتے ہیں۔ انہیں اپنی محنت کا پورا ثمرہ ملنا چاہیے۔ سلطنت انہیں صرف دوسروں کی دستبرد سے بچاتی ہے۔ اس خدمت کا اسے مناسب معاوضہ ملنا چاہیے۔ بس میں تو سلطنت کی طرف سے یہ معاوضہ وصول کرنے کے لیے مامور ہوں۔ اس کے سوا میرا ان غریبوں کی کمائی میں اور کوئی حق نہیں۔ یہ بیچارے مفلس ہیں، جاہل ہیں، بے زبان ہیں۔ اس لیے فی الحال ہم انہیں جتنا چاہیں ستا لیں۔ انہیں اپنے حقوق کی خبر نہیں۔ اپنی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ ہم انہیں جتنا چاہیں پامال کر لیں۔ پر ایک دن ضرور آئے گا۔ جب ان کے منہ میں بھی زبان ہو گی۔ اپنے حقوق سمجھیں گے۔ اور تب وائے بر حالِ ما، بر تکلفات مجھے اپنی آسامیوں سے دور کیے دیتے ہیں۔ میری شان اسی میں ہے، کہ انہیں میں رہوں۔ انہیں کی معاشرت اختیار کروں۔ اور ان کی مدد کروں۔